حفیظ رضا بسروری

شاہ جی کی باتیں خوبصورت یادیں

میں تو کسی کا نقشِ قدم بن کر مٹ گیا مجھ سے نہ پوچھئے کہ گیا کارواں کہاں

امیر شریعت کو میری زندگی میں مرکزی روح (RULING SPIRIT) کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھے۔ وہ اس عہد کے سب سے بڑے محب رسول ﷺ تھے۔ انہوں نے حُبِ رسول ﷺ میں ڈوب کر سنتِ صدیق اکبر ادا کی اور حضور ختم المرسلین ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ کرنے والے خاصبوں اور گرہ کٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ اور اپنے پیچھے مجاہدین احرار کی ایک ایسی جماعت چھوڑ گئے۔ جس کا اوڑھنا بچھونا حب نبی ﷺ ہے۔ اور جو حضور ﷺ کی ختم نبوت کا ہر دو میں دفاع کرتی رہی ہے۔ اور کرتی رہے گی۔ شاہ جی نے جس دور میں یہ سعی جدوجہد کا آغاز کیا وہ ہر لحاظ سے ایک مشکل دور تھا۔ ایک طرف انگریزی حکومت کا جبر و استبداد زوروں پر تھا۔ تو دوسری طرف پنجاب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کا گروہ احرار کی تحریک کے اسلئے خلاف تھا۔ کہ اس نے غریب مسلمانوں میں جینے کا حوصلہ۔ حبِ نبی ﷺ کا ولولہ اور غیر ملکی حکومت کو برصغیر سے نکال باہر کرنے کا بے مثال جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ شاہ جی اور احرار غریب اور متوسط مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ جنہوں نے قرآن اور حدیث کو اپنی جدوجہد کا رہنما بنا کر اس قدر طویل اور شاندار تاریخ حریت مرتب کی۔ کہ آج اور کل کا مؤرخ ان کا تذکرہ اور اعتراف کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شاہ جی بڑی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے مقلد۔ مسلک ولی اللہی پر کاربند اور اکابر دارالعلوم دیوبند کے ہم فکر تھے۔ اپنے عقائد میں بڑے راسخ اور مضبوط تھے۔ اور عقیدے کے معاملے میں فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے عقیدے میں تین چیزیں شامل ہیں۔

(۱) قرآن سے محبت (۲) ختم نبوت کا تحفظ (۳) انگریز سے نفرت۔

شاہ جی کو ایک بار ملنے اور دیکھنے کے بعد بڑے بڑے مخالف بھی ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ برصغیر کی بعض ممتاز شخصیتیں۔ اختلاف فکر و نظر کے باوجود ان کا احترام کرتی تھیں۔ اور ان سے باقاعدہ ملاقات کے لئے اہتمام کرتی تھیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔ اقبال کا شعر شاہ جی کی شخصیت پر کتنا صادق آتا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مردِ درویش جسے حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

شاہ جی کے توسط سے حضرت علامہ اقبال علمائے دیوبند کے بہت قریب ہو گئے تھے اور بعد میں حضرت محدث العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے تبحر علمی کے تو وہ بہت معتقد ہو گئے تھے۔ مشہور انگریز مؤرخ سر جان گنتھر جب ہندوستان کے دورے پر آیا۔ تو اس نے اسی عظیم مجاہد آزادی کو دیکھنا اور ملنا چاہا مگر شاہ جی ان دنوں راولپنڈی جیل میں تھے۔ اس نے اپنی کتاب "INSIDE INDIE" میں شاہ جی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے

لکھا ہے۔

"یہ شخص اگر انگلستان میں پیدا ہوتا، تو اس کی تصویریں کلیساؤں میں لگائی جاتیں۔"

۱۹۴۶ء میں شاہ جی دہلی میں مقیم تھے اور میر احمد حسین شملوی کے مکان پر قیام فرما تھے۔ جواہر لال نہرو وہاں ملنے آئے اور دیر تک رسمی خیر خیریت اور غیر رسمی، سیاست کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر عزیز الرحمن جامعی پہنچے کہ مہاتما گاندھی ملنا چاہتے ہیں۔ فلاں وقت اور فلاں دن۔۔۔۔۔ شاہ جی مقررہ دن ٹانگہ پر بیٹھ کر اپنے دوستوں کے ساتھ انہیں ملنے گئے۔ بھنگی کالونی دہلی میں گاندھی جی کا قیام تھا۔ وہاں پہنچے تو باہر چارپائی پر خان بادشاہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے گلے لگایا، پھر شاہ جی گاندھی جی کو ملنے اندر چلے گئے۔ جہاں بقول شورش کاشمیری، سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کے ترجمے اور تفسیر ہی میں وقت کٹ گیا۔ یہ دونوں سورتیں گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں پڑھتے تھے۔

اسی طرح امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ۔۔۔۔ شاہ جی کو دعوت دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جامعہ ملیہ کے میدان میں رات کو شاعری کا جلسہ تھا۔ جس میں انہوں نے وارث شاہ کے کچھ حسب حال پنجابی اشعار سنائے۔ دہلی والوں نے اسے گالی سمجھا۔ کسی نے امام الہند سے تذکرہ کیا کہ رات عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر میں گالیاں دی ہیں۔

اگلے روز شاہ جیؒ مولانا کے ہاں ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ تو مولانا نے فرمایا

"شاہ صاحب سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لڑھکا دیتے ہیں"

"حضرت! آپ سے کس نے کہا؟"

"کوئی بیان کر رہا تھا"

"کون؟"

"ہر کسی کا نام تو حافظے کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے"

"تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا"

"سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے۔ آپ سے جو تعلق خاطر ہے، اس کے باعث معاً وہ چیز یاد آ گئی"۔

"جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے"

"الحمد للہ وہ پھانس اسلئے دماغ میں رہ گئی کہ آج سے چوبیس یا پچیس سال پہلے، آپ نے ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے جن میں جل، مل قسم کے قافیے تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگلوا دی ہو"

شاہ جی مسکرائے اور کہا

"حضرت، ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو یاد ہے؟"

"میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں۔ گو حافظہ ہر طرح کی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں۔۔۔۔۔ گزرتا ہے لیکن بعض چیزیں حافظے کے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وارث شاہ کا کلام تھا۔ آپ کی وجہ سے حافظے میں ایک تاثر رہ گیا۔ اب جو آپ سامنے آئے تو وہ تاثر بھی تازہ ہو گیا"

۔۔۔ سب سے بہت پہلے کی بات ہے۔ شاہ جی میانوالی جیل میں تھے۔ انگلستان کا ہوم ممبر ہندوستان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے شاہ جی کو ملنے اور دیکھنے کے لئے میانوالی جیل کا دورہ رکھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل بہت

گھبرایا ہوا تھا۔ وہ بار بار شاہ جی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں سے التجائیں کرتا۔ کہ یہ دورہ کامیاب رہے اور رہنما کوئی ایسی بات نہ کریں۔ شاہ جی نے کہا۔ کہ لالہ جی آپ فکر نہ کریں۔ اس دورہ کے روز شاہ جی نے اپنے تمام ساتھیوں سے کہا۔ کہ وہ لیٹ جائیں۔ اور اپنے اوپر کمبل اوڑھ لیں۔ صرف اپنے اپنے پاؤں ننگے رکھیں۔ اور ان کا رخ دروازے کی طرف ہو۔ ایسا ہی ہوا صرف شاہ جی بیرک کی سلاخوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہوم ممبر بڑی رعونت و تمکنت کے ساتھ سیاسی قیدیوں کی بیرک پر پہنچا تو ماسوا شاہ جی سب نے اپنے پاؤں اس کی طرف کر کے اپنی حقارت و نفرت کا اظہار کیا۔ برطانوی نژاد ہوم ممبر شاہ جی سے مخاطب ہوا۔

شاہ صاحب: آپ اچھے ہیں؟

شاہ جی: خدا کا شکر ہے۔

ہوم ممبر: کوئی سوال؟

شاہ: میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔

ہوم ممبر: میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

شاہ جی: جی ہاں! آپ میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائیے!۔۔۔۔

شاہ جی۔۔۔۔ علماء و اکابر دیوبند اور بزرگان رائے پور۔ گنگوہ۔ کان شریف۔ سیال شریف۔ دین پور۔ آکو مہار شریف، گولڑہ شریف۔ علی پور سیداں سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ان مقامات پر اکثر حاضری بھی دیتے اور تقاریر بھی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ہماری معیت میں (۱۹۵۱ء) سیال شریف کے مدرسہ شمس الاسلام کے سالانہ جلسہ پر تشریف لے گئے تھے اور خواجہ قمر الدین سیالوی رحمہ اللہ کے مہمان تھے۔ انہوں نے شاہ جی کی بہت آؤ بھگت کی۔ ہمارے ساتھ معروف احرار رہنما مولانا عبدالرحمن میانوی بھی تھے۔ خواجہ صاحب اور ان کے مریدین نے مثالی مہمان نوازی، حسن سلوک اور بے پناہ احترام کا مظاہرہ کیا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ سیال شریف والے اب یہ بات کیوں بھول گئے ہیں؟ کہ اتحاد بین المسلمین کا اس دور میں سب سے بڑا داعی ان کے ہاں مہمان خصوصی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیوبند تشریف لے گئے۔ رات دارالعلوم میں تقریر کی اور سونے کے لئے مدنی منزل حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی کے ہاں تشریف لے گئے۔ فجر کی اذان ہو گئی تو ابھی وہ سو رہے تھے۔ حضرت مدنی متفکر ہوئے اوز ان کے پاس بیٹھ کر شاہ جی کے پاؤں دبانے لگ گئے۔ شاہ جی ہڑبڑا کر اُٹھے اور حضرت مدنی کو پاؤں دباتے دیکھ کر از حد پریشان ہوئے۔ کہنے لگے حضرت! آپ گنہگار کر رہے ہیں۔ حضرت مدنی نے فرمایا شاہ جی! نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا آپ کو جگا لوں۔ لیکن پھر خیال آیا آپ تھکے ہوئے ہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ پاؤں دابوں۔ تھکاوٹ دور ہو گی، آنکھ کھلے گی تو ممکن ہے نماز قضا نہ ہو!

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے نتیجے میں آپ لاہور جیل میں تھے۔ آپ کے ساتھ مشہور بریلوی عالم سید ابوالحسنات قادری تھے۔ جو نام نہاد سلکی اختلافات اور سیاسی راہوں کے جدا ہونے کی وجہ سے شاہ جی سے کبھی نہ ملے تھے۔ جب جیل میں شاہ جی کو دیکھا۔ ان کے عشق رسول ﷺ عقیدۂ ختم نبوت کی پختگی اور ایمان کی لازوال دینی و روحانی دولت کا مشاہدہ کیا تو شاہ جی کے گرویدہ ہو گئے۔ اور اس بات پر ہمیشہ افسوس کرتے رہے۔ کہ عمر کا زیادہ

حصہ شاہ جی کی معیت کے بغیر کیوں گزارا؟

شاہ جی کی محفل میں تذکرہ ختم نبوت چھڑتے ہی رنگ محفل تبدیل ہو جاتا تھا۔ اور جوش سے لبریز اشعار کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ خصوصاً وہ اشعار جو آپ کے مزاج اور فکر کے آئینہ دار ہوتے وہ حاضرین کے قلوب پر بے حد اثر چھوڑتے تھے۔ آپ کو نبی کریم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی وجہ سے تمام مدعیان نبوت و رسالت سے آپ کو سخت عداوت تھی۔ حقیقت ایمان سے نا آشنا لوگ اس عمل کو مذہبی اور احرار رہنماؤں کی تنگ نظری قرار دیتے ہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ یہ تعصب یا ضد نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی انتہا ہے۔ جو شاہ جی کے دل و دماغ پر جلوہ گر ہوئی۔ لاؤڈ سپیکر تو آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ایجاد ہوئے تھے۔ مگر شاہ جی کی آواز کی بلندی کو اگر دیکھا جائے تو رسول کریم ﷺ کے زمانہ کے ہاشمی یاد آجاتے تھے۔ حضور ﷺ کے عم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب کی آواز کے متعلق علمائے تفسیر نے لکھا ہے۔ کہ آٹھ میل تک پہنچتی تھی۔ اسی طرح لاؤڈ سپیکر کے بغیر شاہ جی نے بڑے بڑے شہروں میں دو دو لاکھ کے کثیر مجمع سے خطاب فرمایا۔

یہ بات اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ کہ تقریر اور خطاب میں شاہ جی کا کوئی ثانی گزشتہ ایک صدی کے دوران برصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ ان کو اپنی تقریر کے دوران اکثر اوقات سامعین، حاضرین کے عجیب اور مشکل ترین سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جن کا وہ اس خوبی اور تاثیر خطابت سے جواب دیتے تھے۔ کہ مجمع عش عش کر اٹھتا تھا۔ اگر ایسے سوالات کسی نور عالم یا خطیب سے کئے جاتے۔ تو وہ جواب کے لئے شاید مہینوں کتابیں کھنگالتے مگر شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے برجستہ گوئی اور فی البدیہہ گفتگو کا جوہر خاص عطاء فرمایا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے حصے میں کم ہی آسکا۔ ان کے تبحر علمی کے سبھی معترف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بے شک بہت بڑے خطیب اور عالم تھے۔ مگر وہ شاہ جی کی طرح عوامی خطیب نہ تھے مولانا کے ہاں اختصار تھا اور شاہ جی کے ہاں ابلاغ۔

ایک جلسہ شاہ جی سے کسی نے سوال کیا۔ حضرت! سیدہ فاطمہ افضل ہیں یا جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری صاحبزادیاں افضل ہیں۔ جب کہ سیدہ رقیہ۔ سیدہ ام کلثوم۔ اور سیدہ زینب۔ آپ سے عمر میں بھی بڑی تھیں۔ فرمایا۔ فاطمہ افضل ہیں کیونکہ وہ نزول وحی کے بعد پیدا ہوئی تھیں اور دوسری نزول وحی سے پہلے! ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدہ خدیجہ میں کیا فرق ہے؟ ارشاد فرمایا بڑا فرق ہے۔ سیدہ خدیجہ کا نکاح محمد بن عبداللہ سے ہوا تھا اور سیدہ عائشہ کا نکاح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔

کسی نے سوال کیا۔ حضرت آپ کو صاحبزادہ فیض الحسن نے کیوں چھوڑ دیا۔ ارشاد فرمایا وہ نوری ہیں نور میں خاکی۔ ان نوریوں سے اُسید کب تک! سب سے بڑے نوری جبریل علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے شب معراج میں میرے نانا کو سدرۃ المنتہیٰ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔

آزادی سے چند ماہ بعد جب کہ پاکستان کے مسلمان احرار رہنماؤں کے سیاسی اختلافات کی بناء پر کچھے کچھے ہوئے تھے۔ شاہ جی پاکستان چوک ڈیرہ غازی خان کی سیرت کانفرنس سے خطاب کرنے لگے تو اچانک نزدیکی مکان سے جلسہ گاہ میں پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ شاہ جی وظیفہ پڑھتے رہے۔ اور پتھر برستے رہے۔ جب یہ سلسلہ بند ہوا تو اس کوہ استقامت نے کہا۔

"تم پتھر برساتے رہے تو میں دل ہی دل میں خوش ہو کر کھڑا رہا اور اسی انتظار میں تھا۔ کہ کوئی پتھر آکر

سیرے دانت توڑ دیتا۔ تو میں اپنے نانا کی سنت کو تازہ کر دیتا۔ جو طائف اور اُحد میں ایس ہی صورت حال سے دو چار ہوئے تھے۔۔۔ ۔۔"

یہ بات کچھ اسی انداز سے کی کہ یک لخت سارا مجمع زار و قطار رونے لگ گیا۔ اور جلسہ کے بعد بہت سے لوگوں نے آکر ان سے معافی طلب کی۔

آزادی سے قبل پشاور کے جلسۂ عام سے خطاب فرما رہے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو سکھ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مسلمان نعرۂ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ مگر ہندو سکھ خاموش تھے۔ انہوں نے ہندوؤں سے پوچھا۔ مجھے بتاؤ "رام" کون ہے؟ انہوں نے کہا خدا۔ پھر سکھوں سے پوچھا۔ "واہ گورو" کس کو کہتے ہو۔ جواب ملا۔ اللہ کو۔! بلند آواز میں فرمایا۔ اگر رام اور واہ گورو اللہ ہے۔ تو پھر تم اللہ اکبر کیوں نہیں کہتے۔ اس پر سب نے نعرۂ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔

شاہ جی کی شخصیت فقر و استغنا۔ صبر و قناعت۔ خودداری اور خود نگہداری کا دلاویز مرقع تھی۔ چاہتے تو آج کل کے خطیبوں اور واعظوں کی طرح لاکھوں روپے کما سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ساری عمر ایسا نہ کیا۔ جو کچھ مل گیا وعظ کو اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ تو بنایا معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اسی میں گزارا کیا۔ اور آزادی کے بعد کا تمام عرصہ کرائے کے ایک معمولی مکان میں بسر کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ضلع میانوالی کا دورہ کر رہے تھے۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ میانوالی سے روانگی کے وقت صوفی اللہ داد مرحوم جو مجلس احرار کے نامور رہنما کار تھے۔ اور شاہ جی کے انتہائی عقیدت مند، وہ شاہ جی، مولانا محمد علی، مولانا عبدالرحمن میانوی اور سائیں میات کے لئے سکینڈ کلاس کی ٹکٹیں لے آئے۔ شاہ جی نے ٹکٹیں دیکھیں اور مولانا محمد علی سے پوچھا۔ ان کا رنگ کچھ اور ہے۔ میں جو ٹکٹیں دیکھتا ہوں وہ زرد ہوتی ہیں اور یہ سبز معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ یہ اونچے درجے کی ہیں۔ فرمایا! مولوی صاحب! آگے کی فکر کرو وہاں اگر اچھا درجہ مل گیا۔ تو بات بن جائے گی۔ یہاں کے درجوں کو چھوڑو ٹکٹوں کو واپس کر کے وہی زرد ٹکٹیں لاؤ (تھرڈ کلاس) صوفی صاحب ٹکٹیں واپس کر آئے اور غالباً۔ سات روپے کا فرق واپس ملا۔ شاہ نے وہ رقم مولوی محمد علی صاحب کو دے دی۔ کہ اس کی رسید کاٹ دو۔ وہ ساری عمر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے رہے۔ میں نے ایک بار سوال کیا۔ حضرت ایسا کیوں؟ اونچے درجہ میں سفر کرنے میں حرج کیا ہے۔ ارشاد فرمایا۔ تھرڈ کلاس میں گدڑی کے لعل مل جاتے ہیں۔ اور میرے وہاں بیٹھنے سے غریب مسلمانوں میں حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

میں ملتان میں ۱۹۶۰ء میں تھا۔ لائل پور (فیصل آباد) سے مولانا تاج محمود مرحوم وہاں کے ممتاز مل اونر میاں محمد شفیع (کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز) کو لے کر آئے جو شاہ جی کے لائل پور میں قیام کے لئے ایک اچھی رہائش گاہ اور مکمل کفالت کی درخواست لے کر آئے تھے۔ ہو سکتا ہے میاں محمد شفیع اس میں اخلاص رکھتے ہوں۔ مگر جب شاہ جی سے مولانا محمد علی نے میاں محمد شفیع سے ملاقات کی درخواست کی۔ اور ساتھ انہی پیشکش کا ذکر کیا۔ تو ارشاد فرمایا۔

"بھائی محمد علی! مجھے کسی مل (MILL) والے سے نہ ملاؤ۔ کسی دل والے سے ملاؤ۔ یہ پیشکش سنگھوں کے مقابلے میں ان کی سیاسی اور معاشرتی ضرورت ہو گی۔ مجھے اب آخر عمر میں کیوں رسوا کرنے لگے ہو؟

میاں محمد شفیع شاہ جی سے ملے مگر دوران ملاقات اس بات کا قطعی ذکر نہ کیا۔!

۱۹۵۹ء میں ملتان کے کچھ دوستوں قاضی احسان احمد، اور مظہر نواز خان درانی نے شاہ جی کے عظیم آباد (پٹنہ) اور امرتسر کی رہائشی جائیداد کے عوض ملتان میں کلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا ان دوستوں نے بحالیات کمشنر کی عدالت میں خود ہی کلیم داخل کر دیا۔ اور جب شاہ جی کا بیان لینے کے لئے انہیں عدالت میں لے جانے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں شاہ جی سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان دوستوں نے کسی طرح شاہ جی کو راضی کر لیا۔

جب شاہ جی عدالت میں پہنچے۔ تو وہاں انکی پذیرائی کی گئی۔ بیان کے دوران صرف اپنی دینی ادبی کتابوں اور لائبریری کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اور بعد میں وہ اپنے مندرجہ بالا ساتھیوں سے کچھ عرصہ ناراض رہے کہ وہ انہیں دنیا کی طرف کیوں راغب کر رہے ہیں۔ مظہر نواز خان درانی کی ذاتی کوششوں سے کلیم منظور ہو گیا اور ایک مکان الاٹ کر دیا گیا۔ آج کل اس جگہ شاہ جی کے بیٹوں نے ایک دینی مدرسہ اور جامع مسجد تعمیر ہے۔ یہ جگہ دار بنی ہاشم کے نام سے معروف ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی (اقبال)

شاہ جی کی زندگی کا یہ استغنائی پہلو اس حدیث کا مفہوم یا تفسیر تھا۔ کہ جس میں فرمایا گیا

(بہترین آدمی فقیہ ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس حاجت لے کر جائیں تو نفع پہنچائے اور اگر اس سے کنارہ کریں تو وہ بھی بے پروا در ہے)

وہ صرف عبادت کے ڈسپلن اور پروگرام کے پابند رہتے تھے۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی ان کے پروگرام میں تبدیلی نہ کر سکتا تھا۔ جماعت کے پروگرام کے علاوہ وہ اپنے احرار رضا کاروں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور انہیں شفقت عطاء فرماتے تھے۔ کہ ہر کوئی اپنی جان کا ہدیہ دینے تک کے لئے تیار رہتا تھا۔ وہ اپنے رضاکاروں کی درخواست جو اپنے شہروں میں انہیں لے جانے کے لئے کرتے تھے۔ کبھی رد نہ فرماتے تھے۔ فوراً اپنی جیبی ڈائری نکال کر تاریخ عطا فرما دیتے تھے۔

شاہ جی عالم و خطیب سیاستدان اور روحانی شخصیت ہونے کے علاوہ شاعری بھی فرماتے تھے ان کا مجموعہ کلام "سواطع الالہام" کے نام سے ان کی زندگی میں انکے فرزند حضرت سید ابوذر بخاری نے شائع کیا۔ شاد عظیم آبادی کی صحبت کی وجہ سے وہ شعر و ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال سے بڑے اعلیٰ تعلقات تھے۔ اور جیسا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت علامہ اپنا کلام شاہ جی کو سنا کر بہت مسرور ہوتے تھے۔ افسوس اقبال کے نام نہاد مؤرخین نے محض تعصب اور تنگ نظری کے سبب اس کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ حضرت علامہ عقیدۂ ختم نبوت کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اور انکی فکر کا یہ پہلو شاہ جی اور دیگر علمائے دیوبند کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے مضبوط و مربوط ہوا۔

برصغیر کے ممتاز شعراء فیض۔ جگر۔ روش۔ نصرت قریشی۔ ۔۔۔۔ تاثیر اور بعد کے دور میں۔۔۔ عدم۔ ساغر۔ احمد ندیم قاسمی۔ عاصی کرنالی۔ عبدالکریم ثمر۔ طاہر شادانی۔ علامہ طالوت (مرحوم) اسد ملتانی۔ شاہ جی کے ہاں اکثر حاضری کرتے تھے۔ دیگر ممتاز شعراء علامہ انور صابری۔ صہبا لطیف انور، آغا شورش کاشمیری۔ عبدالرحیم عاجز، اسمٰعیل امرتسری۔ جانباز مرزا۔ استاد دامن سائیں حیات تو ان کے شریک سفر تھے۔ الغرض شاہ جی کی شخصیت جامع کمالات تھی۔

یہ شاہ جی کی شخصیت کا جاذب نظر اور روحانی پہلو تھا۔ کہ مجلس احرار اسلام میں مختلف عقائد کے قومی رہنما اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور ان میں محبت اور اتحاد کا جو شاندار نظم و ضبط چشم فلک نے دیکھا وہ پھر کہیں نظر نہ آسکا شاہ جی اپنے تمام ساتھیوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان تمام راہنماؤں نے شاہ جی کے جذبۂ جہاد اور عشق رسول ﷺ کے فیضان سے قربانیوں کی ایک لازوال تاریخ حریت ترتیب دی۔ ان رہنماؤں میں مولانا محمد داؤد غزنویؒ چودھری افضلؒ، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن مرحوم، مولانا عبدالقیوم کانپوری مرحوم مولانا عبدالقیوم پوپلزئی مرحوم (پشاور) مولانا غلام غوث مرحوم شیخ حسام الدین مرحوم۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم۔ ماسٹر تاج الدین انصاری۔ قاضی احسان احمد مولانا گلشیر شہید، حافظ علی بہادر، سید نوشیر علی، مولانا عبدالرحمٰن جانباز مرزا، خواجہ عبدالرحیم عاجز، غازی محمد حسین (تاندلیانوالہ) عبدالرحیم جوہر، سردار محمد شفیع، چودھری عبدالعزیز راہوں اور حافظ عبدالمجید نابینا (فیصل آباد) شامل تھے۔ یہ تمام بزرگ اور رہنما شاہ جی کے جذبِ دروں اور نعرۂ حق کی تصویر تھے۔

شاہ جیؒ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک برصغیر کی آزادی (۱۹۴۷ء تک) اور عقیدۂ تحفظ ختم نبوت کے محاذوں پر مردانہ وار لڑتے رہے۔ ان کی یہ جدوجہد جو بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ نہایت کٹھن اور مشکل تھی۔ انہوں نے تحریک خلافت تحریک فوجی بھرتی، بائیکاٹ، تحریک کشمیر، تحریک تحفظ ختم نبوت اور دیگر کئی ملی اور قومی تحریکوں میں حصہ لیا۔ جن کی پاداش میں وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ انگریزی دور میں ان پر سنگین سے سنگین مقدمات چلائے گئے۔ مگر وہ اپنے غیر متزلزل ایمان، روحانی قوت، بزرگان ملت کی دعاؤں اور اپنی جماعت کے وفادار ساتھیوں کی قربانیوں سے ان مشکل مراحل سے باعزت سرخرو ہوتے رہے۔ لالہ موسیٰ کی ایک تقریر کی وجہ سے ان پر آزادی سے قبل دفعہ ۱۲۴ کے تحت مقدمہ چلا۔ اور حکومت پنجاب نے ان کو سزائے موت دلوانے کی سازش کی۔ تو ایک ہندو رپورٹر لدھا رام کے ہائیکورٹ میں اعتراضی بیان کی وجہ سے حکومت کو شرمندہ ہونا پڑا۔ لدھارام جو سرکاری رپورٹر تھا اس نے جسٹس ڈگلسن ینگ کے سامنے کہا:

"میں اس رشی اور منی (روحانی شخصیت) کو دیکھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ سچ یہ ہے کہ دی رپورٹ میں تحریف ورضانہ حکومت کے ایماء پر کیا گیا ہے۔

۱۲۴۔ الف کے اس مقدمہ سے شاہ جی باعزت بری ہوئے۔

چارہ گر نے مجھ کو باندھا تھا سمجھ کر ناتواں ؎ ذرا تڑپا تو ٹکڑے ہی نہ تھے زنجیر کے (جگر)

شاہ جی کی زندگی کے بے شمار واقعات اور پہلو ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے ایک عرصہ چاہیے۔ ان کی داستانیں قریہ قریہ، بستی بستی، پرانے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ وہ جامع الصفات شخصیت تھے۔ اور ان جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ شاہ جی نے لوگوں کے اعتراض یا اعتراف کی پرواہ کئے بغیر تمام عمر اعلائے کلمتہ الحق کا فریضہ انجام دیا۔ وہ علمائے حق کے محبوب تھے۔ حضرت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری نے برصغیر کے ۵۰۰ نمائندہ علماء کے اجتماع میں انہیں امیر شریعت کا خطاب عطا فرما کر ان کے دست مبارک پر بیعت جہاد کی۔ شاہ جی حضرت شیخ العصر علامہ انور شاہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا۔ انور شاہ پیچھے رہ

گئے "اسی طرح شاہ جی کے متعلق حضرت اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ: "شاہ جی کی باتیں عطاء الٰہی ہوتی ہیں"
حضرت شیخ الاسلام مولانا بشیر احمد عثمانیؒ فرماتے تھے" شاہ جی اسلام کی مشین ہیں" مولانا حسین احمد مدنیؒ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ۔ مفتی کفایت اللہ مفتیٔ اعظم ہندؒ۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ۔ پیر طریقت عبد القادر رائے پوریؒ۔ حضرت گولڑویؒ۔ حضرت خواجہ ضیاء الدینؒ۔ (سیال شریف) معنوی طور پر شاہ جی سے بہت محبت رکھتے تھے۔ آپ کی پہلی بیعت طریقت پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف سے تھی۔ ان کے انتقال کے بعد تجدید بیعت حضرت رائے پوریؒ سے کی۔

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی کرم نوازی تھی کہ میرے لاشعوری دور میں، جب میں مڈل کا طالب علم تھا، مجھے حضرت امیر شریعت کی نگہ لطف کرم عطا فرما دی۔ میرے سکول کے ایک سکھ استاد سردار خزان سنگھ اپنے درس میں حضرت امیر شریعت کا نام گرامی اکثر لیا کرتے تھے۔ مجھے "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کا نام۔ اس کا حسن۔ اس کی ترکیب بہت پسند آئی۔ اور میں غائبانہ طور پر اس شخصیت کا عقیدت مند ہو گیا۔ پھر حضرت مولانا بشیر احمد جو قافلۂ احرار و جمعیت کے ممتاز رہنما تھے۔ کی قیادت و سیادت میں شاہ جی کا اکثر ذکر ہوتا۔ انجمن تبلیغ الاسلام۔ چونڈہ ہر سال چونڈہ میں دینی جلسہ منعقد کیا کرتی تھی۔ اس انجمن کی خدمات تبلیغ اسلام اور دین کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں بہت قابل قدر ہیں میں نے انجمن کے سالانہ جلسہ کا اشتہار پڑھا۔ اور اس میں شاہ جی کی تقریر کا اعلان پڑھا تو اپنے طالب علم ساتھیوں کے ہمراہ پیدل چونڈہ گیا۔ وہاں شاہ جی کو دیکھا اور سنا۔ لاشعوری دور کی بات ہے یاد نہیں کیا کیا سنا۔ مگر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس شخصیت کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد پسرور میں احرار سٹوڈنٹس کا قیام عمل میں لے آیا۔ اور دور و نزدیک شاہ جیؒ کی تقریر میں سننے چلا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ۸-۹ اپریل ۱۹۴۴ء کو میں فیروز پور احرار پراونشل کانفرنس پر چلا گیا۔ وہاں شاہ جی ایک ٹینٹ میں قیام پذیر تھے۔ میں نہایت عقیدت سے ملا۔ پاس صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہؒ بیٹھے تھے۔ مجھ سے میرا پتہ پوچھا۔ میں نے پسرور کا ذکر کیا۔ تو گلے لگا لیا فرمانے لگے۔ یہ تو میرے استاد حضرت مولانا نور احمدؒ پسروری ثم امرتسری کا شہر ہے۔ پھر مولانا روشن دینؒ پسروری کی اپنے ساتھ رسارت میانوالی جیل ۱۹۲۱ء کا حوالہ دیا۔ مولانا بشیر احمد کے تعلق کی بات ہوئی۔ شاہ جی نہرا پا شفقت بن گئے۔ اُس وقت سے لے کر ۱۹۶۲ء تک وہ میرے ساتھ عزیزانہ شفقت برتتے رہے۔ سیالکوٹ، لاہور، امرتسر، چونڈہ اور دوسرے کئی مقامات پر انہی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ اور پھر میری عاجزانہ دعوت پر پسرور بھی آئے۔ ۲- روز قیام فرمایا ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات میں وہ اکثر مولانا مظہر علی اظہر (سیالکوٹ / پسرور / نارووال / قلعہ سوبا سنگھ کے حلقہ) صاحبزادہ فیض الحسن شاہ مرحوم (دیہاتی حلقہ تحصیل ڈسکہ پسرور) اور جناب چوہدری محمد عبداللہ خان (چونڈہ / ظفروال) کی انتخابی مہموں میں حصہ لینے تشریف لاتے رہتے تھے۔ اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان کی تقاریر نوٹ کر کے "آزاد" لاہور میں رپورٹنگ کر دیتا تھا۔ تعلیم میرے لئے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اسی دوران انہوں نے قوم کا وہ شاندار تجزیہ پیش کیا۔ جو تمام برصغیر میں مشہور ہوا۔ چونڈہ کے ایک اجتماع میں شاہ جی نے صاحبزادہ فیض الحسن سے پوچھا۔ شاہ صاحب! آپ کے حلقۂ انتخاب کا کیا حال ہے؟ صاحبزادہ صاحب نے کہا۔ شاہ جی جیت رہا ہوں۔ انشاء اللہ فتح میری

ہے۔ شاہ جی ہنسے۔ صاحبزادہ صاحب سے کہا شاہ صاحب! میں اس قوم کو اچھی طرح جانتا ہوں یہ تقریر میری سنتی ہے۔ بچہ نہ ہو تو تعویذ آپ سے لیتی ہے۔ "تفسیر ابوالکلام کی پڑھتی ہے۔ حدیث حسین احمد مدنی سے سنتی ہے۔ فقہ اور فتویٰ کے لئے مفتی کفایت اللہ کے پاس جاتی ہے۔ علم احمد علی سے سیکھتی ہے مگر ووٹ کسی اور کو دیتی ہے۔"

بعد میں شاہ جی کا یہ تجزیہ صحیح ثابت ہوا۔ اور صاحبزادہ صاحب چوہدری سرفراز سے شکست کھا گئے۔

میں نے ۱۹۴۸ء میں گرینڈلیز بنک میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ء میں شاہ جی لاہور آئے۔ پوچھا کیا کرتے ہو؟ عرض کیا "بنک میں ملازم ہوں۔" فرمانے لگے بنک کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ کچھ الٹا سیدھا جواب دیا۔۔۔ پھر پوچھا یہ بنک کس کا ہے۔۔۔ میں نے کہا انگریزوں کا! اس پر خاموش رہے اور قاضی احسان احمد جو پاس بیٹھے تھے سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

"احسان احمد! میری بدقسمتی ملاحظہ ہو۔ باپ ساری عمر انگریز کے خلاف لڑتا رہا۔ انگریز گیا۔ تو اولاد نے اس کی ملازمت کر لی"

میں نے لگے روز جا کر استعفیٰ دے دیا۔ اور ملتان چلا گیا۔ سارا ماجرا بتایا فرمانے لگے میرا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا۔ پوچھنے لگے اب کیا ارادہ ہے میں نے کہا آپ کے پاس رہوں گا۔ مسلسل تین ماہ تک شاہ جی کے ساتھ رہا۔ سینکڑوں جلسوں کی رپورٹنگ کی۔ اور ان کی کسی بھی ملازم سے بڑھ کر خدمت کی۔ کندیاں سٹیشن پر مجھے گھر جانے کا حکم دیا۔ اور تین سو روپے کی خطیر رقم مجھے دی کہ میں اپنی اہلیہ کو جا کر ان کی طرف سے دے دوں! میں نے بہت انکار کیا مگر نہ مانے فرمانے لگے۔

"تم نے میری بہت خدمت کی۔ میں بہت خوش ہوں۔ اور تمہارے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔ تم کبھی اپنے آپ کو اکیلے محسوس نہ کرنا میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا"

بعد کی ساری زندگی میں وہ ہمیشہ میرے لئے دعا گو رہے۔ میں ان کی خدمت میں مسلسل ملتان حاضری دیتا رہا۔ وہ اس عہد کے عظیم انسان، تاریخ ساز شخصیت اور سب سے بڑے عاشق رسول ﷺ تھے۔

حافظ جان محمد خادم

شامِ غم

امیر شریعت عطاء اللہ شاہ
چوں رختِ سفر بست روح برفلک
بگفتند خادم ہمہ چشمِ تر
عزیز و اقارب کہ غفران نمک

۱۳۸۱ھ